سوال

(84)روح سنت

جواب

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

روح سنت

(غلام محمد اللہ جرمن)

الجواب بعون الوہاب بشرط صحة السؤال

وعلیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ، والصلاة والسلام علیٰ رسول اللہ، أما بعد!

سنت اپنے باطنی اور روحانی پہلو کے نقطہ نظر سے بھی اسی درجہ اہمیت رکھتی ہے۔ جس درجہ کہ اپنے ظاہری پہلو کے لحاظ سے ظاہری پہلو سے جاری مراد اس کے اسناد کی تاریخی استوار ہے۔ اور وہ شے ہے جسے ہم شرعی یا اس کی آئینی و فقہی حیثیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سنت کی پیروی کو اتنا ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے۔ کہ اس کے بغیر سلامی زندگی کا صحیح مفہوم ہی متعین نہ سکے کیا اسلام تک رسائی حاصل کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریق نہیں کہ ہم اعمال واعادات اور امر و نواہی کے ایک وسیع و عریض سلسلے کو ماننے پ مجبور ہوں جب کہ اس میں بعض نہات معمولی باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جو سنت سے ماخوذ و ستفاد ہوں یہ مانا کہ آپ ﷺ بہت بڑے انسان تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے ہر گوشہ کی تقلید و اطاعت کے کہیں یہ معنی تو نہیں کہ اس کہ اس سے فرد کی شخصی آذادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

اعتراض کی نوعیت بہت پرانی ہے۔ ہمیشہ اسلام دشمن عناصر نے اسکو دہرایا ہے۔ اور کہا ہے کہ مسلمانوں کے اسباب زوال میں سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ انہوں نے سنت کی اطاعت اور پیروی کی بجائے تشدد اختیار کیا ان کی یہ رائے ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ طرز عمل آیندہ چل کے انسان کی حریت رائے بہت بڑی قدغن ثابت ہو سکتا ہے۔ اور معاشرے کے طبعی ارتقاء کو روک دینے باعث بن سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ کہہ دیتے ہیں اس ضمن میں یہ حقیقت جان لینے کی ہے۔ کہ چاہے ہم اس سوال کا تسلی بخش جواب سے سکین یا نہ دے سکیں اسلام کا مستقبل بہر حال سنت لئ صحیح صحیح موقف کی تعین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر سنت کا مقام و موقف سمجھ میں آگیا تو اسلام کی روح کو تاریک بنا دینے کے زمہ دار قرار پایں گے۔ ہمیں بجا طور پر ناز ہے کہ اسلام دوسرے ادیان کیطرح متصوفانہ اذعان کا قائل نہیں بلکہ اس کے دروازے ہمیشہ بحث و تمحیص کے لئے کھلے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم صرف یہ معلوم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے کہ سنت نے کن چیزوں کو ہمارے لئے ضروری ٹھہرایا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ معلوم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ کہ اس کی تہہ میں کیا اسباب و علل کارفرما ہیں۔ اسلام کا مزاج ایسا ہے۔ کہ توحید کو صرف عقیدہ تک محدود نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ چاہتا ہے کہ زندگی کے تمام گوشے اسی رنگ میں رنگے جایئں۔ اور عقیدہ فکر کے دائروں سے نکل کر اس کے تسلط واقتداء کے دائرے عمل و حرکت کے ایک ایک حصہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ پھر چونکہ اس مقصد جلیل تک پہنچنے کا تنہا ہی راستہ ہے۔ اس لئے قدرتا اس کی آغوش میں تمام مدرکات آگے ہیں۔ اور اس جامعت کے ساتھ نہ تو رتی بھر اضافہ ممکن ہے۔ اور نہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان میں زرہ برابر بھی کمی کر دی جائے۔ انتہا یت

اور پسند کو اس میں دخل نہیں جب ہم نے ان تعلیمات کو تسلیم کرلیا۔ جن کو قرآن کریم نے ہم تک پہنچایا ہے۔ یا آپ ﷺ کو رسالت تک ہماری ان تک رسائی ہوئی ہے۔ تو ہمارے لئے ضروری ہوجاتا ہے۔ کہ ان کو پورا پورا مانیں بغیر کسی استثناء کے سب کی عقابیت پر ایمان لائیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ اپنی اصل قدر و قیمت اور افادیت کھو دین گی۔ اسلام کے بارے میں یہ اصولی اور بنیادی سی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کہ یہ چونکہ عقل و دانش کی اہمیتوں کو مانتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیمات کے رد و قبول میں ہر شخص مختار ہے، ۔ کہ جس جس کو حصہ معقول سمجھے۔ مان لے۔ اور جس کو معقول اور دانش کی کسوٹیوں پر پورا اترتا ہوا نہ دیکھے ترک کردے۔ یہ غلط فہمی اس بنا پر ابھری کہ لوگ موجودہ عقابت کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ موجودہ عقلیت اور چیز ہے۔ اور نفس عقل شے دیگر عقل کا کامایک طرح کی نگرانی ہے جہاں تک دینی تعلیمات کا تعلق ہے۔ اس کے دائرہ فرائض میں صرف یہ بات داخل ہے۔ کہ یہ دیکھے کہ جو کچھ اس پر مذہب کی طفف سے عنڈ کیا جارہا ہے آیا اس کو یہ آسانی سے برداشت کرسکتی ہے۔ بغیر اس کے کہ یہ فلسفہ کے چکروں میں پڑے اور اس کی سحر طرازیوں سے متاثر ہو اسلام سے متعلق عقل و دنش کا بے لاگ فیصلہ یہی ہے جس کا اظہار کئی مرتبہ ہوچکا ہے۔ کہ یہ اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کا یہ ہر گز معنی نہیں کہ جو شخص اسلام سے لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ اس کی تعلیمات کو ماننے پر خوامخواہ مجبور ہی ہے۔ یہ تو اس شخص کی مزاج طبعیت پر موقوف ہے۔ اور یا بالآخر روح و باطن کی بیداری اور قلب و ضمیر کی روشنی و ہدایت کا قصہ ہے۔ وہ اس کو تسلیم کرتا ہے۔ یا نہیں البتہ صحیح ہے۔ کہ جس شخص کا بھی دامن تعصبات سے پاک ہے وہ اس کی تعلیمات کو عقل و حکمت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ٹھرا سکتا۔ رہی یہ بات کہ اسلام کی بعض حقیقتیں اس کو فہم و ادراک کی معمولی سطحوں سے اونچی نظر آتی ہیں۔ تو یہ ممکن ہے مگر اس کو تناقض نہیں کہیں گے۔ عقل اور فلسفہ عقلیت کے فرق کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ ان کے حدود فرائض کیا ہیں۔ مذہبی امور میں عقل کا فریضہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ آلہ تسجیل کی طرح ہر ہر معاملہ میں جو پش آئے۔ ہاں یا نہ کو مثبت دے اور بس جب کہ عقلیت حیثیت پر قانع نہیں۔ یہ اس سے بڑھ کر خیال آرائی کے میدانوں میں قدم زن ہوتی ہے۔ پھر صرف عقل کی طرح اس کی حیثیت ایک مستقل بالذات اور منفرد وظہور کی بھی نہیں۔ بلکہ یہ سراسر موضوعی اور مزاج سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ عقل تو اپنے حدود کو پہچانتی ہے۔ مگر عقلیت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا یہ ادعا ہے کہ تمام عالم اور اس کے اسرار و رموز اس کی انفرادی جھپٹ میں آتے ہیں۔ اگرچہ فی الواقع اس کا دائرہ درجہ تنگ ہے ایک مین تضاد عقلیت میں یہ بھی ہے کہ یہ ماموردین میں ت ولیسے حقائق کو مان لینے پر آمادہ نہیں جو فکر و اندیشہ کی گرفت میں آنے والے نہ ہوں لیکن جب معاملہ علم کا ہو تو پھر اس کی رائے یہ ہوتی ہے کہ یہ پھرنا پیدا کنار ہے۔ اور کوئی ضروری نہیں کہ اس کی تمام پہنایئاں انسان معلوم کر ہی لے۔ عقلیت یا فلسفہ عقلی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہی ایک بڑا سبب ہے۔ اعاد و انکار کا اسی سبب سے بہت سے عصری مسلمانوں نے آپ ﷺ پر ایمان لانا غیر ضروری سمجھا لیکن ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ حد سے بڑھا ہوا اعتماد صحیح نہیں بات اتنی واضح اور عقلیت کی لئے چارگی اس درجہ مسلم ہے۔ کہ اس کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کہ کانٹ عقلیت کے قلعے پر یہ کہہ کر ایک دفعہ پھر حملہ کرے کہ عقل کی پرواز حدود فضائوں میں ہی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک دماغ و فکر کی افتاد و مزاج کا تعلق ہے۔ کہ ہر گز اس قابل نہیں کہ اس کارخانہ ہست و بود میں جو ایک طرح کی کلیست جاری و ساری ہے۔ اس کی حقیقت و کہنہ کو معلوم کرسکے۔ ہم جو کچھ معلوم کرسکتے ہیں وہ صرف تفصیلات و عوارض ہیں از بست ولا نہایت تک ہماری رسائی نہیں ہوسکتی۔ مزید براں ہمارے علم کی رسائی کا یہ حال ہے۔ کہ ہم اب تک یہ بھی نہیں جان پائے کہ خود یہ طلسم زندگی کیا ہے۔ دینی عقائد کے معاملے میں جو کہ فوق الادراک بنیادوں پر قائم ہیں۔ ہمیں ایک ایسی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ جس کی عقلی صلاحیتیں فلسفہ مادی کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ہوں اور عمومی و موضوعی عقل سے کہیں بڑھ اس کی خوبیاں ہوں جس سے کہ ہم سب بہر مند ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ہمیں ایک پیغمبر کی ضرورت ہے اگر ہمیں قرآن کے بارے میں یہ یقین ہے۔ کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور آپ ﷺ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے۔ تو صرف اخلاقی نقطہ نظر سے بلکہ عقلا بھی ہم مجبور ہوجاتے ہیں۔ کہ آپ کی رہنمائی پر آنکھیں بند کرکے ہم بھروسہ کریں۔ بند کرکے بھروسہ کرنے کے معنی یہ نہین کہ ہم غور و فکر کی صلاحیتوں سے دست بردار ہوجایئں بلکہ اس کے برعکس اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا بہترین استعمال کریں۔ اور آپ ﷺ کے اوامر نواہی کے پیچھے جو معانی و حکمت پہناں ہیں ان کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کریں۔ چاہے ہم اس کھوج اور تفحص میں کامیاب ہوئیں۔ یا نہ ہوسکیں ناکامی کے بعد بھی اطاعت ہر حال ضروری ہے۔ اس کو ایک سپاہی اور فوجی کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ فرض کیجئے کہ سپہ سالار عسکر نے اسے ایک خاص اہمیت کی جگہ بر قبضہ کرلینے کا حکم دیا ہے اس صورت میں اس فوجی کا یہ فرض ہے کہ فی الفور اس جگہ کو گھرے۔ پھر اگر حکم کی اس تعمیلکے ساتھ ساتھ اپنے افسر کے اس حکم کی جنگی اہمیت کو بھی سمجھتا ے تو یہ اس کے لئے اور فوج کے لئے بلاشبہ خوش آئند ہے۔ لیکن اگر اس کی جنگی قدر قیمت اس کی سمجھ میں آئی تب بھی تعمیل حکم اس پر لازم ہے اور اس کو یہ اختیار ہر گز حاصل نہیں ہے کہ اس میں ردوقدح کرلے یا اس کو ٹالی جائے ہم مسلمانوں کا آپ ﷺ کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عقیدہ ہے کہ آپ اس عسکر اسلام اور سپاہ ایمان کے بہترین اور کامیاب ترین سالار و قائد ہیں اور امور دین کے اجتماعی و روحانی پہلوں کو اس سے کہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں جتنا کہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ لہذا جب آپ ہمیں کوئی حکم دیں گے۔ یا کسی معصیت سے روکیں گے تو ہم لا محالہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ انسانی اصلاح کے لے بہر حال ایسا حکم دینا ناگزیر ہے اور اس میں روحانی اجتماعی پہلوں کو ملحوظ و مرعی رکھا گیا ے ہ یہ ممکن ہے کہ یہ پہلو کبھی تو بالکل واضح ہوں اور

بھی ان میں وضوع کی مقدار بالکل کم ہو اور اس شخص کی گرفت میں نہ آسکیں۔ جن کو کہ دینی امور میں زیادہ مہارت نہیں اسیطرح بھی بھی تو آپ ﷺ کے احکام و اوامر میں جو گہری حکمت پوشیدہ ہے وہاں تک انسانی فہم کی رسائی ہوجاتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف سطحی اسباب حکم تک ہی نظر و بصر کے دائرے پھیل کے رہ جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اطاعت فرمانبرداری کے سوا چارہ نہیں بشرطیکہ ان احکام کا ثبوت مستند ہو پھر ان احکام و اوامر کی ایک تقسیم اہم اور نسبت کم اہم کی بھی ہے۔ اس صورت میں ہمارے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے۔ کہ ہم کو ترجیح دی جائے لیکن کسی حکم کو بھی اس گمان فاسد کی بنا پر چھوڑ دینا روا نہیں کہ اس میں کوئی بنیادی اہمیت دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ آپ ﷺ سے متعلق قرآن میں صراحتا آیا ہے۔۔۔۔ قرآن۔۔۔۔۔ (نجم) وہ کوئی بات بھی اپنی طرف سے کہنے کے مجاز نہیں۔ اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ اس وقت تک کوئی کلمہ نہیں کہتے ہیں جب تک کہ اس کی کوئی ثبت وجہ سامنے نہ آجائے اور یہ کہ جب تک اللہ تعالیٰ اس پر آپ ﷺ کو مامور نہ فرمائے۔ یہ ہے سبب جس کی وجہ سے تالب وتلب دونوں لحاظ سے ہم سنت کی پیروی پر مجبور ہیں بشرط یہ کہ ہمارا نقطہ نظر اسلام کے بارے میں مختلف نہ ہو پھر جب پیروی سنت کے ایجابی تقاضے ابھر کر سامنے آگئے تو یہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہوگیا کہ سنت نے اسلام کی جس اجماعیت کی تشکیل کی ہے اس کے حکم اسرار پر غور کرے۔ اور یہ بتائے کہ اس تفصیلی نظام حیات کے اندر کیا روح کارفرما ہے۔ جس کو مسلمان ولادت سے لے کر موت تک کہ تمام لمحوں میں ملحوظ رکھتا ہے اور جس پر کہ عمل پیرا ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ اس نظام حیات میں وہ مسائل بھی داخل ہیں جو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی جنھیں بظاہر کوئی اہمیت نظر نہیں آتی مسلمان کو اس حقیقت کا کھوج لگانا ہوگا کہ آپ ﷺ نے یہ ہر بات میں اپنے اسوہ حسنہ کی پیروی اطاعت پر کیوں زور دیا ہے مثلا اگر میرے دونوں ہاتھ صاف ہیں تو بایئں ہاتھ سے کھالینے میں کیا مضائقہ ہے یا داڑھی رکھ لینے اور منڈا ڈالنے میں کیا فرق ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ایسے نہیں کہہ جن کا تعلق سراسر صورت وقالب سے ہے کیان مسائل کا تعلق انسانی رتقی سے ہے اور اس سے معاشرہ کی فلاح و بہبودی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اس مرحلہ پر ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ ان سوالات کا متعین جواب دیں کیونکہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہا سلام کی ترقی انحطاط کا دارومدار آپ ﷺ کی پیروی پر ہے۔ اگر پیروی اطاعت موجود ہے تو ترقی پائی جائے گی اور اگر بد قسمتی سے اطاعت فرمانبرداری کا داعیہ کمزور ہے تو اسی نسبت سے انحطاط و تنزل کا پیش آنا لازمی ہے۔ ہمارے نزدیک ہر معاملہ میں سنت کی پیروی کی اہمیت کئی وجود سے ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح انسان کی عادات واطور کے لئے ایک سانچہ مہیا ہوجاتا ہے اور ہر ہر شخص ایسی زندگی بسر کرتا ہے جس میں شعور کارفرما ہے بیداری جلوہ گر ہے اور ضبط نفس نمایاں ہے وہ کام اور اعمال اور افعال جن کی تہہ میں کوئی قاعدہ اور ترتیب نہ پائی جائے فکر و روح کی ترقی میں روکاوٹ ثابت ہوجاتے ہیں لہذا ایسے تما عمال وفعال کی مقدار انسانی زندگی میں ممکن حدتک کم ہونا چاہیے کیونکہ ان سے فکر و روح کا ارتکاز تباہ ہوجاتا ہے اور وہ اس لائق نہیں رہتی کہ اپنی صلاحتیوں کو کسی ایک مکز پر مجمع کرسکے اس لے ہم جو قدم بھی اٹھایئں اور جو کام بھیکریں اس کو ہامرے شعور ارادہ کے مطابق ہونا چیہے اور اس پر اخلاقی نگرانی جارہی رہنا چاہیے ی مگر یہ اسف وقت تک ہونے ولاال نہیں جب ت ک ک ہم اپنے فکر و شعور کی جنبشوں کا محاسبہ کرنا نہ سیکھیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعمال کی اس حقیقت کو اس جامع نافع جملے میں نہایت کامیابی سے ادا فرمایا ہے۔ **اسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا** اس سے پہلے اپنے محاسبہ نفس سے فارغ ہوجا ئو کہ عند اللہ تمہارا محاسبہ ہو اس سے پہلے ہم اشارۃ بتاچکے ہیں کہ اسلامی نظریہ عبادت صرف عبادات ہی کو اپنے آغوش میں نہیں لیتا ہے۔ بلکہ اس میں ہماری پوری زندگی کا انعکاس ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہماری ذات کے روحانی و مادی دونوں پہلوں میں ایک طرح کی وحدت پیدا ہوجائے اگر یہ صحیح ہے توف حیات انسانی میں ان تمام عوامل کو حتی المقدور کم ہونا چاہیے جن میں شعور وضبط نفس کے عناصر کا فقدان ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب محاسبہ و نگرانی کہ اس عمل کو ہم جاری رکھیں یہ اس سلسلہ کا پہلاقدم ہے۔ اور وہ یقینی راستہ ہے کہ جس سے ہم ضبط نفس کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اگر ہم روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں سنت کی پیروی کا خیال رکھتے ہیں۔ اور مادۃ ہمارا قدم اسی سمت اٹھتے ہیں۔ تو یہ چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی ہی اہمیت کے ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سے محاسبہ نفس اور ضبط و نگرانی کے ذریعے ہمیشہ بیدار رہتے ہیں رہے بڑے سے بڑے کام تو ان کے متلق تو شعور کی بیداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ تو شعور کے بغیر صادر ہو ہی نہیں سکتے۔ شور و ادراک کا دامن تو اس وقت چھوٹتا ہے جب چھوٹے چھوٹے ناقابل التفات کامون کا سامنا ہو اس وقت یہ عموما ہو کر رہتے ہیں۔ اور ذہن و رفکر کو غافل رکھتے ہیں ہاں اگر ان حقیر اور کم رردجہ کے اعمال میں بھی مراقبہ وضبط کی عادت قائم رہتی ہے تو ہر انکی منفعت دوچند ہوجانے میں کیا شوبا بظاہر واقعی اس بات میں کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم کس ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ دایئں ہاتھ سے یا بایئں ہاتھ سے ہم نے داڑھی بڑھا رکھی ہے۔ یا منڈا رکھی ہے۔ لیکن اگر ہمارے اعمال میں ایک تعظیم رونما ہے ہم ایک خاص سانچہ میں اپنی عادات کو ڈھالنے کے عادی بن تب انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ مسلسل ضابط و ترتیب کا خیال رکھنا اور اپنے کو قواعد و پابندیوں میں بندھا ہوا محسوس کرنا آسان نہیں اگرچہ انسان اس طرح کی خاص تربیت پائے ہوئے ہو وجہ ظاہر ہے ذہن انسانی بھی اس طرح کسل تساھل کا عادی ہے۔ جس طرح کے انسانی جسم و عضلات ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اگر آپ کسی

ایسے آدمی کو پیدل چلنے کی زحمت دیں گے ۔ جو اپنے گوشہ عافیت میں پڑے رہنے کا عادی ہے ۔ جو کبھی چلا پھرا نہیں تو وہ چند ہی قدم چل کر تھک جائے گا ۔ اور ایک قدم آگے نہیں بڑھا پائے گا ۔ بخلاف اس کے کہ جو میلوں چلنے کا عادی ہے اس سے توقع کی جا سکتی ہے ۔ کہ وہ طویل سے طویل سفر کو بغیر کسی زحمت کے جاری رکھ سکے گا یہ بھی اگرچہ سفر کی کوفت محسوس کرے گا لیکن ٹھرائے گا نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوگا اس کوفت میں بھی لذت کا ایک پہلو پایا جاتا ہے ۔ اور یہ اس سے مانوس ہے ۔ یہ فلسفہ سنت کی ہمہ گیریوں کا اور یہ دوسی تعطیل ہے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے ۔ کیونکہ سنت زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے ۔ جب ہم اس طرح مسلسل مشق و تمرین سے اپنے تمام اعمال و مروکات کو امر او نہی کے خانوں میں تقسیم کردیں گے ۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا ۔ کہ نفس شعور میں ضبط و انضباط کے دو اعلیٰ راسخ ہوجائیں گے ۔ اور زندگی کا ی نہج طبعیت ثانیہ بن جائے گا ۔ یہی میں اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ جس نسبت و مقدار سے محاسبہ کی مشق و تمرین کا یہ سلسلہ دراز ہوتا جائے گا اسی نسبت سے اخلاقی و ذہنی کسلمندیاں کم ہوتی چلی جائیں گی اور ہم اخلاق و آداب کی منزلوں کے زیادہ قریب ہوتے جاوے گے ۔ مشق و تمرین کا لفظ چاہتا ہے کہ اس کی تہ میں شعور اور احساس کا جذبہ ہمیشہ کار فرما رہے کیونکہ اگر عمل بالغتہ کی سطح سے اس حد تک آگرے کہ ہماری تمام زندگی مکان کی ہو کر رہ جائے اور بے جان مشینری کی طرح انزات و منہیات کا علمیہ جاری رہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے ۔ کہ سنت نے اپنی قدر و قمیت کھو دی اور روح ختم ہوگئی جو مقصود اصلی تھی ۔

آپ ﷺ کے بعد آخری دور میں کیا ہوا یہی نا کہ ظاہر سنت تو قائم ہے اور ان کا چرچا بھی ہوا مگر ان کے ساتھ جو احساس محاسبہ اور جذبہ نگرانی وابستہ تھا ہو جارتا رہا صحابہ رضوان اللہ عنہم اجمعین کی زندگیاں اس انازکی نہ تھیں ان کی پیروی سنت کا مطلب نہ تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر اور شعور و ادراک سے مالامال ہو کر ایک ہادی اور رہمناک سپرد کردیا تھا تاکہ وہ ان کے اعمال کی سمتوں کو قرآن کی طرف پھر دے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سنت کی پیروی سے فوائد حاصل کیے جو دوسرے نہیں حاصل کرسکے اور اس میں خطا اس نظام سنت کی نہیں ان کے لئے وضع کے گئے تھے عمل بالسنۃ کی اہمیت کو ختم کرنے والے عوامل میں پلا بمبر تصوف کا ہے اس نے ان قوتوں کو کوک زور کیا جن کا تعلق انسنی فعالیت سے ہے اور ان صلاحیتوں کو چمکایا جن کا تعلق انسان کی داخلی تاثر یزیوں سے ہے ۔ عمل بالسنہ کو عملی زندگی میں ختم کردینا تو تصوف کے لئے اس بناء پر ممکن نہ تھا کہ ابتداء ہی سے اس کو اسلامی زندگی میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ لیکن صوفیائے عظام کی کوششوں سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا مزاج اررخ یکسر بدل گیا ۔ اور یہ بجائے ایک فعالی قوت و ھڑکت ہونے کے مضح افاطونی رمزیت ہو کر رہ گیا ۔ فقہا او عاملۃ الناس کے نقطعہ نظر سے بھی اس کو گرتد پہنچا ہے ۔ کیونکہ فقہاء نے سنت سے یہ مراد لیا کہ یہ محض ایک قانون ہے ۔ اور سلسلہ ضوبط سے تعبیر ہے ۔ اور عوام نے یہ خیال کیا کہ ایک خوبسور تسرف ہے جو معنی کے در سہوا سے بالکل نہی ہے ۔ لیکن تعیب اس پ ہے کہ مسلما نوں کے تمام گروہوں نے اگرچہ قرآن اور اس کی ان تعبیرات و تشریحات کما حقہ استفادہ نہیں کیا جو سنت میں مذکورہ ہیں تاہم اسلامی تعلیمات کا وہسر چشمہ جو سنت سے فیضیاب ہوتا ہے جوں کا توں قایم رکھتا ہے اور اس میں عملی دشواری حائل نہیں کہ اس کی طرف دوبارہ رجو کیا جاسکے ۔ پھر سنت جیسا کہ مغرب زدہ معاندین اسلام سمجھتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کی کوششوں سے ہم تک نہیں پہنچی ہے ۔ جو فریسیوں کی طرح الفاظ پرست اور جامد ہوں بلکہ یہ ان لوگوں کی مساعی جمیلہ کا نسخہ ہے جو بلا کی شعور رکھتے تھے جن مین غضب کی عزیمت اور کہری بصیرت و عمل کے واعی موجزن تھے اس کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو صحابہ رضوان اللہ عنہم اجمعین کو دیکھو ان میں یہی صفات تھیں جو ان کطرہ امتیاز یسان کو تاریخ میں حیرت انگیز کامیابی کیوں نصیب ہوئی اسی بنا پر کہ ان میں ہمیشہ ذہنی شعور زندہ رہا یہ سنت کی ایک جزئی میں جو حکمت پوشیدہ ہے ۔ اس سے باخبر رہے اور ان زمہ داریوں سے آگاہ رہے جو مذہب نے ان کے کندھوں پر ڈالیں ۔ سنت کی اہمیت کا یہ ہے انفرادی پہلو ۔

دوسری وجہ جس سے کہ عمل بالسنۃ کا فلسفہ واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کی برکت سے اجتماعی زندگی کا تصور پیدا ہوتا ہے اور اجمتا عیخیر و فلاحکا ایک نقشہ ترتیب پاتا ہے کبھی آپ نے غور کیا عام انسانوں میں اختلاف کا کیا سبب ہے اور یہ کیو نکر بڑھتا اور فروغ پاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ چونکہ ہر شخص کے دل میں دوسروں کے اعمال مقاصد بارہ میں ایک طرح کی غلط فہمی پائی جاتی ہے ۔

اس لئے کوئی بھی ایک دوسرے کو سمجھانے کی سعی نہیں کرتا اور یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ ہر ہر شخص کے مزاج و طبیعت کا یہ قدرتی اختلاف صرف معمولیاختلاف میں پیدا نہیں کرتا بلکہ اس سے ہر قوم کی عادات و اطوار کے مگطابق زندگی بسر کرتے کسی قوم پر ایکعرصہ گزر جاتا ہے تو یہی عادات و اطوار کا اختلاف تہذیب و تدن کا اختلاف بن جاتا ہے ۔ اور باہمی اتفاق و اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے پھر اگر کوئی قوم یہ فیصلہ کرلیتی ہے ۔ کہ اس کی زندگی یسا یک اہم آہنگی پیدا ہوجائے اور اس کی عادو اطوار اور تہزیب و ثقابت کا ایک متعین قالب تیار ہوجائے تو ان میں باہمی اختلاف ختم ہوجاتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے ۔ کہ یہ ایکدوسرے کے اعمال و مقاصد کو اچھی طرح سمجھ سکیں ۔ اس بناء پر

اسلام نے جوانفرادی بہبودی کے ساتھ ساتھ اجتماعی فلاح کا بھی ضامن ہے ۔ اپنی تعلیمات مین اس نکتہ کو ینادی ٹھرایا کھمعاشرہ کے تمام افراد میں عادات واطوار کی کامیابی پائی جائے ۔ اوران میں سنت کے التزام سے ایسے کوائف بیدار ہوجایئں جر ہر حال یسان کے تہذیبی و دینی اتحاد کو برقرار رکھیں چاہے ان کے اجتماعی و اقتصادی حالات ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف اورجدا کیوں نہ ہوں یہ سچ ہے کہ بعض لوگ سنت کے اس نظام میں ایک گونہ سختی اور تشدد محسوس کریں گے لیکن اس کی ااس خدمت کو کون بھلاسکتا ہے ۔ کہ اس نے اسلامی معاشرہ کو استحکام بخشا ہے ۔

اس کوایک متعین شکل اور صورت میں ڈھالا ہے ۔ اور ہر ہر نزاع و اختلاف کی مضرتوں سے بچایا ہے ۔ اس کی اس افادیت کو سمجنے کے لئے ان انقلابات پر غور کیجئے جو مغرب میں معاشرتی اصلاحات کے نام سے وقع پزیر ہوئے اورایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ اس طرح کے مسائل کسی قوم میں اس وقت پیدا ہوتے ہیجب لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہمارے بعض قوانین اور رسم رواج مکمل نہیں ہیں ۔ اس لئے ان میں کچھ تبدیلیاں ہونی چاہییں ۔ اہل مغرب نے چونکہ اپنے ہاں ان نقائص کو پالیا اس لئے اصلاح کے درپے ہوئے مسلمان اس سورت حالات پر اس بناء پر محفوظ رہے کہ یہ اہنے آپ کو قرآن کا پابند ٹھراتے ہیں اوراس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہامرے تمام اعمال آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کے مطابق ہونے چاہییں ۔ یہ اصول اپنی جگہ ایسا مستحکم اور استوار ہے کہ ااس کو اپنانے کے بعد تبدیلی و تفسیر کا سوال پیدا نہین ہوتا ۔ مگر یہ کہ خود یہ اصول ہی شک وریب کا نشانہ بنے ۔ اوران کی صداقت ہی محل نظر قرار پائے اس سے ہم مسلمانوں مین اتحادواتفاق کے اس امکان کو عملانافز ہوتے دیکھ سکتے ہیں جس کو بنیاد مرصوص کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے اور ف گر ہم اصول کو پوری طرح حرزجان بنالیں تو معاشرہ ان تمام بے کار و طائل کوششوں سے بے نیاز ہوجاتا ہے ۔ جو فروعی مسائل کے لئے کی جاتی ہیں ۔ پھر اگر معاشرہ ان اختلافات سے بازف آئے جسکو جدل و بحث کے تقاضوں نے پیدا کیا ہے اوراس پریشانی خاطر سے دستکش ہوجائے ۔ جس کو کہ کلامی موشگافیوں نے جنم دیا ہے ۔ اوراس کے بعد اس کی بیاد کتاب وسنت کی پیرری پر رکھی جائے تو ایسے مواقع نکل آیئں گے کہ معاشچرہ اپنی تمام صلاحیتوں کو افراد کی اجتماعی و نفاردی فالح و بہبودی کے لئے استرعمال یملائیں یہی نہیں بلکہ معاشرے کے لئے یہ بھی ممکن ہوجائے گا ۔ کے تمام افراد کے روحانی ارتقآئ کے لئے مورجدوجہدک سکے انسانی معاشرہ کی تنظیم و اصلاح کا یہی وہ نصب العین ہے جو اسلام کی اصلی غرض و غائت ہے آیئے ۔ اب عمل بالسنۃ میں جو تیسری بڑی مصلحت ہے اس پر غور کریں ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم جب سنت پر عمل کی زمہ داری کو قبول کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی آپ ﷺ کی اقتدائ کو پشن نظر رکھیں گے ۔ اوراس کا تیجہ یہ ہوگا کہ ہم عمل کی ہر ہر صورت میں چاہے وہ اخیتار پر مبنی ہو چاہیے ترک پر ۔ آپ ﷺ کی عملی زندگی پر غور و کر کرنا کی عادت ڈالیں گے کیونکہ ہمیں اپنے تمام اعمال کا جائزلینا ہے اور اپنی زندگی میں نہ دیھنا ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت و پیروی کا مقصد پورا ہورہا ہے ۔ یا نہیں ۔ اس طرح گویا ایک عظیم ترین انسانی شخصیت کو اثر نفوظ کو ہمارے روزمرہ کے مشاغل میں منعکس ہونے کا موقع یسر آئے گا بلکہ یہی وہ روحانی اثر نفوذ ہوگا جو ہماری زندگی کی سٹینزی کو متحرک رکھے گا ۔ اس کا یہ فائدہ ہگاکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم یہ رائے رکھن پر مجبور ہوں گے ۔ کہ علاوہ اس کے آپ ﷺ اللہ کے محبوب ترین اخلاقی پیغمبر ﷺ ہیں آپ ﷺ ایک مکمل زندگی بخشنے والے بھی ہیں اس مرحلہ پر جب کہ عمل بالسنۃ کی یہ فصلاختام و پہنچ رہی ہے ہمیں اس بات کا فیصلہ بھی کرلینا چاہیے کہ ہم آپ ﷺ کے منصب و موقف کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ۔ کیا ہم انہیں دوسری مصلمین و حکم ای طرہ صرف ایک حکم مصلح اور فلسفی ہی سمجھتے ہیں ۔ یا اللہ کا ایسا فرستادہ خیال کرتے ہیں کہ جو ہر آن وحی والہام کی روشنی میں اسی کی اطعت و پیروی میں مصروف ہے جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا نقطعہ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے اوراس میں کسی غلط فہمی کے ابھرنے کا امکان ہی نہیں کہ اللہ کا یہ بندہ جس کو نبی آخرالزمان ﷺ قرار دیا گیا ۔ ۔ اور جس کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے ۔ اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا ۔ کہ صبح شام زندگی کے ہر عمل میں اللہ کی وحی اس کے قلب و فکر کو روشنی بخشنے اور یہ وحی ہدایت کے ان انور سے اس کے بندوں کے لئے اجالوں کا بندوبست کرے ۔ اگر آپ ﷺ کے متعلق یہ وضاحت صحیح ہے ۔ تو اس کا انکار یا اس کی تعلیمات کے بعض حصوں کا انکار رہوا یا کم ازکم اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس کی عطاء کردہ ہدایت کی قدر قیمت گھٹا دی گئی ہے ۔ اوراگر یہ وضاحت درست نہیں ہے ہم اس خیال کو منطقی طور پر آگے بڑھاتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کوئی آخری فیلہ نہیں ہین ۔ اور موجودہ مسائل و مشکلات کا کوئی دوسرا معقول حل بھی سوچا جاسکتا ہے تو یہ خیال او جن نتائج کی طرف بھی لے جائے ممکن ہے ۔ اسلام کی روح بہرحال اس سے متفق نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ قرآن نے اس معاملے میں دوٹوک رائے کا اظہار فرمایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ قرآن ۔ ۔ ۔ ۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ۔ اور اپنی نعمت اتمام حجت تک پہنچادی ۔ اور تمہارے لئے ادیان میں اسلام کو پیروی و اطاعت کے لئے چن لیا ہم اسلام کو تمام تمدنی تنظیمات سے بلند اور اونچا مانتے ہیں کیونکہ یہ پوری زندگی سے تعرض کرتا ہے اس میں دنیا کی گھتیوں کو بھی سلجھایا گیاہ ۔ اور عقبیٰ کی پیچد گیوں کو بھی اور نفس روح کے مسائل بھی اس کی پلیٹ میں آتے ہیں ۔ اور جسم ک تقاضے بھی فرد کی زندگی کا نقشہ بھی کھینچتا ہے ۔ اوراجتماعی زندگی کی تشکیل بھی اس کے فرائض میں داخل ہے ۔ یہ صرف اس سے بحث نہیں کرسکتا ۔ کہ انسان کو مادی و طبعی قیود سے آذادی دلائے ۔ بلکہ ان مادی و طبعی قیود کا خیال بھی رکھتا ہے ۔ یہ انسان سے محالات کا مطالبہ نہیں کرتا

بلکہ اس کا تقاضا صرف اس حد تک محدود ہے۔ کہ انسان میں جس قدر صلاحتیں مضمر ہیں۔ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اور ایسی سطح تک پہنچنے کی جدوجہد کی جائے جو حق سے قریب تر ہے جس میں رائے اور عمل میں کامل ترین توفیق ہے اسلام صرف ایک راہ نہیں بلکہ تنہا یہی راہ ہے جو حق وصواب کی طرف لیجانے والی ہے اور جو شخص اس دعوت کو لایا ہے وہ صرف ہادی نہیں بلکہ تنہا وہی ہادی ہے پس اس کی اطاعت عین اسلام کی اطاعت ہے اور اس کی اطاعت روگردانی حقیقت اسلام سے روگردانی کے مترادف ہے۔
(الاعتصام لاہور حجیت حدیث)

ھذا ما عندي واللہ أعلم بالصواب

فتاویٰ علمائے حدیث

جلد11ص318-331

محدث فتویٰ